

# تفہیم القرآن

## خُم السجده

(۳)

اُس ساعتؑ کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے، وہی اُن سارے پھلوں کو جانتا ہے جو اپنے شکوفوں میں سے نکلتے ہیں، اسی کو معلوم ہے کہ کونسی مادہ حاملہ ہوئی ہے اور کس نے بچہ جنما ہے۔ پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے، ہم عرض

تے اُس ساعت سے مراد قیامت ہے، یعنی وہ گھڑی جب بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ دیا جائے گا اور اُن نیک انسانوں کی دادرسی کی جائے گی جن کے ساتھ بدی کی گئی ہے۔

اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ گھڑی کب آئے گی۔ یہ جواب ہے کفار کے اس سوال کا کہ ہم پر بدی کا وبال پڑنے کی جو دھمکی دی جا رہی ہے وہ آخر کب پوری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سوال کو نقل کیے بغیر اُس کا جواب دیا ہے۔

اللہ اس ارشاد سے سامعین کو دو باتوں کا احساس دلایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ صرف ایک نیت ہی نہیں بلکہ تمام امورِ غیب کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے، کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جو خدا جزئیات کا اتنا تفصیلی علم رکھتا ہے اُس کی نگاہ سے کسی شخص کے اعمال و افعال کا چوک جانا ممکن نہیں ہے، لہذا کسی کو بھی اُس کی خدائی میں بے خوف ہو کر من مانی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے اس فقرے کا تعلق بعد کے فقروں سے جڑتا ہے۔ اس ارشاد کے معانی بعد جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس پر غور کیجیے تو ترتیب کلام سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا نظر آئے گا کہ قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنے کی فکر میں کہاں پڑے ہو، خدا اس بات کی کرو کہ جب وہ آئے گی تو اپنی ان

کر چکے ہیں، آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے۔ اُس وقت وہ سارے معبودان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے، اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

انسان کبھی بھلائی کی دُعا مانگتے نہیں تھکتا، اور جب کوئی آفت اس پر آجاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے، مگر جونہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت

گمراہیوں کا تمہیں کیا خمیازہ جگتنا پڑے گا یہی بات ہے جو ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی تاریخ پوچھنے والے ایک شخص سے فرمائی تھی۔ صحاح اور سنن اور مسانید میں حد تو اترا تو پہنچی ہوئی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور سفر میں کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک شخص نے دُور سے پکارا یا محمد۔ آپ نے فرمایا بولو کیا کہنا ہے۔ اس نے کہا قیامت کب آئے گی؟ آپ نے جواب دیا ویجک انھا کائنۃ لا محالۃ فما اعدت لھا؟ بندہ خدا، وہ تو بہر حال آئی ہی ہے۔ تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی؟

یعنی اب ہم پر حقیقت کھل چکی ہے اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ جو کچھ ہم سمجھے بیٹھے تھے وہ سراسر غلط تھا، اب ہمارے درمیان کوئی ایک شخص بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ خدائی میں کوئی دوسرا بھی آپ کا شریک ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت کے روز بار بار ہر مدحی میں کفار سے کہا جائے گا کہ دنیا میں تم خدا کے رسولوں کا کہا ماننے سے انکار کرتے رہے، اب یوں تو حق پر وہ تھے یا تم؟ اور ہر موقع پر کفار اس بات کا اعتراف کرتے چہ جائیں گے کہ واقعی حق وہی تھا جو انہوں نے بتایا تھا اور غلطی ہماری تھی کہ اُس علم کو چھوڑ کر اپنی جہالتوں پر اصرار کرتے رہے۔

یعنی مایوسی کے عالم میں یہ لوگ ہر طرف نظر دوڑائیں گے کہ عمر بھر جن کی سیوا کرتے رہے شاید ان میں سے کوئی مدد کو آئے اور ہمیں خدا کے عذاب سے چھڑا لے، یا کم از کم ہماری سزا ہی کم کرائے مگر کسی طرف کوئی مددگار بھی ان کو نظر نہ آئے گا۔

کا مزا چکھاتے ہیں، یہ کہتا ہے کہ ”میں اسی کا مستحق ہوں، اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئیگی، لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹا یا گیا تو وہاں بھی فرسے کرونگا“ حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم تبا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکر جاتا ہے۔ اور جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

اے نبی، ان سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور تم اس کا انکار کرتے رہے تو اس شخص سے بڑھ کر ٹھیک ہوا اور کون ہوگا جو اس کی مخالفت میں دوڑتک نکل گیا ہو؟

۶۵ بھلائی سے مراد ہے خوشحالی، کشادہ رزق، تندرستی، بال بچوں کی خیر وغیرہ۔ اور انسان سے مراد یہاں نوع انسانی کا ہر فرد نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو انبیاء اور صلحاء بھی آجاتے ہیں جو اس صفت سے متبرک ہیں جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، بلکہ اس مقام پر وہ چھوڑا اور کم طرف انسان مراد ہے جو برا وقت آنے پر گر کر گڑنے لگتا ہے اور دنیا کا عیش پاتے ہی آپسے سے باہر ہو جاتا ہے۔ چونکہ نوع انسانی کی اکثریت اسی کمزوری میں مبتلا ہے اس لیے اسے انسان کی کمزوری قرار دیا گیا ہے۔

۶۶ یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنی اہلیت کی بنا پر ملا ہے اور میرا حق یہی ہے کہ میں یہ کچھ پاؤں۔

۶۷ یعنی ہماری اطاعت و بندگی سے منہ موڑتا ہے اور ہمارے آگے ٹھکنے کو اپنی توہین سمجھنے لگتا ہے۔

۶۸ اس مضمون کی متعدد آیات اس سے پہلے قرآن مجید میں گزر چکی ہیں۔ اس کو پوری طرح سمجھنے

کے لیے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفسیر القرآن جلد دوم، ص ۲۷۰-۲۷۵-۳۲۶-۳۲۹-۳۳۹۔ جلد سوم ص ۶۵۷

۷۷- الزمر، آیات ۸-۹-۲۹-

۶۹ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض اس خطرے کی بنا پر ایمان لے آؤ کہ اگر کہیں یہ قرآن خدا ہی

کی طرف سے ہوا تو انکار کر کے ہماری شامت نہ آجائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سرسری طور پر

عقرب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ

یے سوچے سمجھے تم انکار کر رہے ہو، اور بات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہو، اور خواہ مخواہ کی ضد میں آکر مخالفت پرتل گئے ہو، یہ کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ تم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ تمہیں اس قرآن کے خدا کی طرف سے نہ ہونے کا علم ہو گیا ہے اور تم یقین کے ساتھ یہ جان چکے ہو کہ خدا نے اسے نہیں بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے کلام الہی ماننے سے تمہارا انکار علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان کی بنا پر ہے، جس کا صحیح ہونا اگر بادی النظر میں ممکن ہے تو غلط ہونا بھی ممکن ہے۔ اب ذرا ان دونوں قسم کے امکانات کا جائزہ لے کر دیکھ لو۔ تمہارا گمان فرض کرو کہ صحیح ہی نکلا تو تمہارے اپنے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ بس یہی ہو گا کہ ماننے والے اور نہ ماننے والے، دونوں یکساں رہیں گے۔ کیونکہ دونوں ہی کو مرگ مٹی میں مل جانا ہے، اور اگے کوئی زندگی نہیں ہے جس میں کفر و ایمان کے کچھ نتائج نکلنے والے ہوں۔ لیکن اگر فی الواقع یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور وہ سب کچھ پیش آگیا جس کی یہ خبر دے رہا ہے، پھر بتاؤ کہ اس کا انکار کر کے اور اس کی مخالفت میں اتنی دُور تک جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے! اس سے تمہارا اپنا مفاد یہ تقاضا کرتا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ اس قرآن پر غور کرو۔ اور غور کرنے کے بعد بھی تم ایمان نہ لانے ہی کا فیصلہ کرتے ہو تو نہ لاؤ، مگر مخالفت پر کمر بستہ ہو کر اس حد تک لگے تو نہ بڑھ جاؤ کہ جھوٹ اور مکر و تلبیس اور ظلم و ستم کے ہتھیار اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے استعمال کرنے لگو، اور خود ایمان نہ لانے پر اکتفا نہ کر کے دوسروں کو بھی ایسا لانے سے روکتے پھرو۔

یہ اس آیت کے دو مفہوم ہیں اور دونوں ہی اکابر مفسرین نے بیان کیے ہیں:

ایک مفہوم یہ ہے کہ عقرب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے ممالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اُس وقت انہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ آج ان سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں دے رہے ہیں، وہ سراسر حق تھا۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آجانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے

حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیٹھی ملک پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو پورے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں وہ محض اس معنی میں اللہ کی نشانیوں نہ تھیں کہ اہل ایمان ملک پہ ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اس معنی میں تھیں کہ یہ فتح ممالک دنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جلد میں ایک عظیم الشان مذہبی، اخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب لے کر آئی تھی جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسا کے بہترین جوہر کھلتے پھلے گئے اور بہترین اوصاف و تہ سے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدنیا درویشوں، اور گھٹے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی امید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبار دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جاسکتے ہیں، اس انقلاب نے وہ فضائل اخلاق فرما زو اٹوں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں، فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں، ٹیکس وصول کرنے والوں کی تحصیلداری میں، اور بڑے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیئے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ معاشرے میں عام انسانوں کو اخلاق اور کردار اور طہارت و نطافت کے اعتبار سے اتنا اونچا اٹھایا کہ دوسرے معاشروں کے چیدہ لوگ بھی ان کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اُس نے اوہام و خرافات کے چکر سے نکال کر انسان کو علمی تحقیق اور معقول طرز عمل کی صفات شاہراہ پر ڈال دیا۔ اُس نے اجتماعی زندگی کے اُن امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انھوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو سکے، مثلاً زنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے درمیان اوپر نیچ کا امتیاز اور محبت چھٹا قانونی حقوق اور عملی معاشرت میں مساوات کا فقدان، عورتوں کی پستی اور بنیادی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حکومت کا تنقید و محاسبے سے بالاتر رہنا، عوام

کا بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے احترامی، جنگ میں وحشیانہ حرکات، اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب بڑھ کر خود عرب کی سبزمین میں اس انقلاب نے دیکھتے دیکھتے طوائف الملوکی کی جگہ نظم، خونریزی و بد امنی کی جگہ امن، فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و طہارت، ظلم و بے انصافی کی جگہ عدل، گندگی و ناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جہالت کی جگہ علم، اور نسل در نسل چلنے والی عداوتوں کی جگہ اخوت و محبت پیدا کر دی، اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ دیکھ سکتے تھے انہیں دنیا کا امام بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جسے مخاطب کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اُس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کو برابر دکھاتے جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زوال کے دور میں بھی اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پا کر اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے ظالم غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں پائے گئے ہیں اور آج تک پاتے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہونو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صیدیوں، عسکران رہے اس وقت غیبائیوں کے ساتھ اُن کا کیا سلوک تھا اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانہ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آجانے کے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آفاق ارض و سماء میں بھی اور انسانوں کے اپنے وجود میں بھی لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائے گا جن سے اُن پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن جو تعلیم دے رہا ہے وہی برحق ہے۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آفاق ارض و سماء اور خود اپنے وجود کو تو

تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے؟ آگاہ رہو، یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔  
سُن رکھو، وہ ہر چیز پر مضبوط ہے۔

لوگ اُس وقت بھی دیکھ رہے تھے۔ پھر زمانہ مستقبل میں ان چیزوں کے اندر نشانیاں دکھانے کے  
کیا معنی۔ لیکن یہ اعتراض بھی ویسا ہی سطحی ہے جیسا اوپر کے مفہوم پر اعتراض تھا۔ آفاقِ ارض و سما تو  
بے شک وہی ہیں جنہیں انسان ہمیشہ سے دیکھتا رہا ہے، اور انسان کا اپنا وجود بھی اسی طرح کا ہے  
جیسا ہر زمانے میں دیکھا جاتا رہا ہے، مگر ان چیزوں کے اندر خدا کی نشانیاں اس قدر بے شمار ہیں کہ  
انسان کبھی ان کا احاطہ نہیں کر سکا ہے، نہ کبھی کر سکے گا۔ ہر دور میں انسان کے سامنے نئی نئی نشانیاں آتی  
چلی گئی ہیں اور قیامت تک آتی چلی جائیں گی۔

۱۷ یعنی کیا لوگوں کو انجامِ بد سے ڈرانے کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اس دعوتِ حق کو جھٹلانے  
اور رک پہنچانے کے لیے جو جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ ان کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہے۔  
۱۸ یعنی ان کے اس رویہ کی بنیاد یہ وجہ یہ ہے کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کبھی ان کو  
اپنے رب کے سامنے جانا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔  
۱۹ یعنی اُس کی گرفت سے بچ کر یہ کہیں نہیں سکتے اور اُس کے ریکارڈ سے ان کی کوئی حرکت چھوٹ  
نہیں سکتی۔